سلسلۂ انجمن اشاعت اردو نمبر (۲)

نظم

سپاس جناب امیرؑ

اور

دوسری نظمیں

از

مرحوم علامہ سر اقبالؒ

مرتبہ

تصدق حسین تاج

مطبوعۂ احمدیہ پریس چار مینار حیدرآباد (دکن)

۱۹۳۸ء

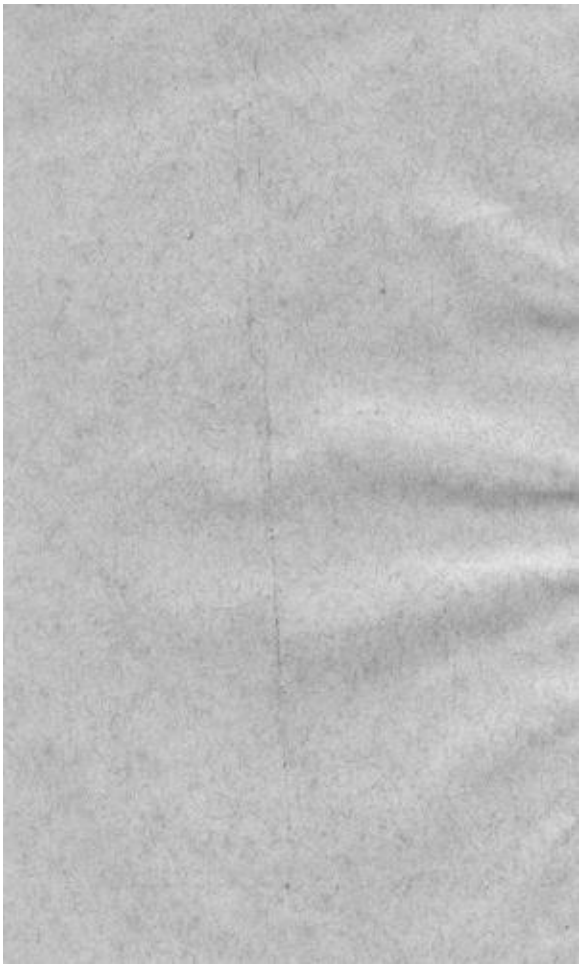

17 AUG 1971

LIBRARY IQBAL ACADEMY, KARACHI
Book No. [redacted]
20 MAY 1969

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سپاس جناب امیرؑ

(مطبوعہ مخزن جنوری ۱۹۰۵ء)

ذیل کی نظم درج کر کے آج ہم اُن احباب کے تقاضوں سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ جو پروفیسر اقبال صاحب کے فارسی کلام کے لئے اکثر دفعہ بیحد اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں تاہم احباب کے اصرار سے ہم اُسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم باظہار عقیدت شیخ صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں۔

MUSLIM ZIAEE
کتبخانہ مسلم ضیائی

اے محوِ ثنائے تو زباں ہا — اے یوسفِ کاروانِ جاں ہا
اے بابِ مدینۂ محبت — اے نوحِ سفینۂ محبت

اے ماحیِ نقشِ باطلِ من — اے فاتحِ خیبرِ دلِ من
اے سرِّ خطِ وجوب و امکاں — تفسیرِ تو سورہاے قُرآں
اے مذہبِ عشق را نمازے — اے سینۂ تو امینِ رازے
اے سرِّ نبوتِ محمدؐ — اے وصفِ تو مدحتِ محمدؐ
گردوں کہ برفعت ایستادہ است — اے بامِ بلندِ تو فتادہ است
ہر ذرہ در گہت چو منصور — در جوشِ ترانۂ اَنَاالطور
بے تو نتواں باو رسیدن — بے او نتواں بتو رسیدن
فردوس ز تو چمن در آغوش — از شانِ تو حیرت آئینہ پوش
جانم بغلامئ تو خوشتر — سر بر زدہ ام ز جیبِ قنبر
ہشیارم و مستِ بادۂ تو — چو سایہ ز پا فتادۂ تو
از ہوش شدم مگر بہوشم — گوئی کہ نصیریٔ خموشم
دانم کہ ادب بہ ضبطِ راز است — در پردۂ خامشی نیاز است
اما چہ کنم مے تولا — تند است بروں فتد ز مینا

ز اندیشهٔ عاقبت رهیدم
جز غمِ آلِ تو خریدم

فکرم چو بجستجو قدم زد — در دیر شد و در حرم زد
در دشتِ طلب بسے دویدم — دامن چو گردباد چیدم
در آبله خارها خلیده — صد لالهٔ تهِ قدم دمیده
افتاده گره بروے کارم — شرمندهٔ دامنے غبارم
پویان بے خضر سوئے منزل — بر دوش خیال بستہ محمل
جویائے مئے و شکستہ جامے — چوں صبح بباد چیدہ دامے
پیچیده بخود چو موج دریا — آواره چو گردباد صحرا
وامانده ز در دنارسیدن — در آبلهٔ شکسته دامن
عشقِ تو دلم ربود ناگاه — از کار گره کشود ناگاه
آگاه ز هستی و عدم ساخت — بتخانهٔ عقل را حرم ساخت
چوں برق بخرمنم گذر کرد — از لذتِ سوختن خبر کرد

بربادِ متاعِ ہستیم داد   جامے زمے حقیقتم داد

سرمست شدم زپا فتادم   چوں عکس زخود جدا فتادم

پیراہنِ ما و من دریدم   چوں اشک زچشم خود چکیدم

خاکم بفراز عرش بُردی   زاں راز کہ با دلم سُپردی

واصل بکنار کشتیم شد   طوفانِ جمال زشتیم شد

جُز عشق حکایتے ندارم   پروائے ملامتے ندارم

از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم گریم تپم گدازم

پیشکش

بحضورِ سر سیّد علی امام مدظلہ العالی

علامہ اقبالؒ کی یہ نظم مثنوی اسرارِ خودی کے پہلے اڈیشن میں درج ہے، جو ۱۹۱۵ء میں ایک محدود تعداد میں شائع ہوئی تھی

اے امام! اے سیدِ والا نسب — دودمانت فخرِ اشرافِ عرب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی — عقلِ کُل را حکمت آموز آمدی
آشنائے معنئ بیگانۂ — جلوۂ شمعِ مرا پروانۂ
مرغِ فکرم گلستاں نادیدہ است — از ریاضِ زندگی گُل چیدہ است
ایں گل از تارِ رگِ جاں بستہ ام — تازہ تر در دستِ تو گلدستہ ام
بود نقشِ ہستیم انگارۂ — ناقبولے ناکسے ناکارۂ
عشق سوہاں زد مرا آدم شدم — عالمِ کیف و کمِ عالم شدم
حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام — در رگِ مہ دورۂ خوں دیدہ ام

بهر انساں چشم من شبها گریست — تا دریدم پردهٔ اسرار زیست

از درونِ کارگاهِ ممکنات — بر کشیدم سرّ تقویم حیات

من که این شب را چو مه آراستم — گردِ پائے ملتِ بیضاستم

ملتے در باغ و راغ آوازه اش — آتشِ دلها سرود تازه اش

ذره کشت و آفتاب انبار کرد — خرمن از صد رومی و عطار کرد

آهِ گرمم رخت بر گردوں کشم — گرچه دودم از تبارِ آتشم

خامه ام از همتِ فکرِ بلند — رازِ این نه پرده در صحرا فگند

قطره تا همپایهٔ دریا شود — ذره از بالیدگی صحرا شود

ملت را جسم است شاعرا چشم او — جسم را از چشمِ بینا آبروست

چشم از نورِ محبت روشنم — اشکبار از دردِ اعضائے تنم

نذرِ اشکِ بیقرار از من پذیر!

گریهٔ بے اختیار از من پذیر!

حافظ

۱۹۱۴ء

مندرجہ ذیل اشعار "اسرارِ خودی" کے صرف پہلے ایڈیشن میں درج ہیں۔

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار — جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار
رہنِ ساقی خرقۂ پرہیزِ او — مے علاجِ ہولِ رستاخیزِ او
نیست غیر از بادہ در بازارِ او — از دو جام آشفتہ شد دستارِ او
چوں خراب از بادۂ گلگوں شود — مایہ دارِ حشمتِ قاروں شود
مفتیِ تسلیمِ او مینا بدوش — محتسب ممنونِ پیرِ مے فروش
طوفِ ساغر کرد و شلِ رنگِ مے — خواست فتحی از رباب و چنگ و نے
در رموزِ عیش و مستی کاملے — از خمے خونِ دلے یا در گلے
رفت و شغلِ ساغر و ساقی گذاشت — بزمِ رنداں شے باقی گذاشت

چوں جرس صد نالہ رسوا کشید عیش ہم در منزل جاناں ندید
در محبت پیرو فرہاد بود بر لب او شعلۂ فریاد بود
تخم نخل آہ در کہسار کاشت طاقت پیکار با خسرو نداشت
مسلم و ایمان او زنار دار رخنہ اندر دینش از مژگان یار
آنچناں مست شراب بندگی است خواجہ و محروم ذوق خواجگی است
"دعوی او نیست غیر از قال و قیل" "دست او کوتاہ و خرما بر نخیل"
آں فقیہ ملت می خوارگاں آں امام امت بیچارگاں
گوسفند است و نوا آموخت است عشوہ و ناز و ادا آموخت است
دلربائیہائے او زہر است و بس چشم او غارتگر شہر است و بس
ضعف را نام توانائی دہد ساز او اقوام را اغوا کند
از بزیوناں زمیں زیرک‌تر است پردۂ عودش حجاب اکبر است
نغمۂ چنگش دلیل انحطاط ہاتف او جبرئیل انحطاط
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش چوں مریدان[۱] حسن دارد حشیش

۱؎ فرقہ باطنیہ ۱۲

از تخیل جنتے پیدا کند — مر ترا بر نیستی شیدا کند

ناوک اندازے کہ تاب از دل برد — ناوکِ او مرگ را شیریں کند

مارِ گلزارے کہ دارد زہرِ ناب — صَید را اوّل ہمی آرد بخواب

عشق با سحرِ نگاہش خودکشی است — کُشتنش مشکل کہ مارِ خانگی است

حافظِ جادو بیاں شیرازی است — عُرفیِ آتش زباں شیرازی است

ایں سُوئے ملکِ خودی مرکب جہاند — آں کنارِ آبِ رُکن آباد ماند

ایں قتیلِ ہمتِ مردانۂ — آں ز رمزِ زندگی بے گانۂ

دستِ ایں گیرد ز انجم خوشۂ — چشمِ آں از اشک دارد توشہ

روزِ محشر رحم اگر گوید بگیر — عُرفیا! فردوس و حور او حریر

غیرتِ او خندہ بر حوَرا زند — پُشتِ پا بر جنّتُ الماوے زند

بادہ زن با عُرفیٔ ہنگامہ خیز — زندہ! از صحبتِ حافظ گریز

ایں فسوں خوانِ زندگی از ما رُبود — جامِ او شانِ جمی از ما رُبود

محفلِ اُو درخورِ ابرار نیست — ساغرِ او قابلِ احرار نیست

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر
الحذر از گوسفنداں الحذر

خطاب بہ تاجدار دکن

اقبال نے اس نظم کے ساتھ فارسی کی مثنوی "رموز بیخودی"
کا ایک نسخہ اعلیحضرت بندگانعالی کی خدمت اقدس میں بطور
ہدیہ محضر ارسال کیا تھا جسے شرف قبول حاصل ہوا۔

اے مقامت برتر از چرخ بریں — از تو باقی سطوت دین مبیں
جلوۂ صدیق از سیمائے تو — حافظِ ما تیغ جوشن خائے تو
از تو مارا صبح خنداں شام ہند — آستانت مرکز اسلام ہند
دوشِ ملت زندہ از امروز تو — تاب ایں برق کہن از سوز تو
بندگانستیم ما تو خواجہ — از پئے فردائے ما دیباچہ
گوہرم را شوخیش بے باک کرد — تا گریبان صدف را چاک کرد
پیش سلطان ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خونِ جگر آوردہ ام

غزل

(پوری غزل کے بارہ شعر ہیں)

سنہ ۱۹۰۱ء

۲۔ ہمصفیر و تم مری عالی نگاہی دیکھنا
شاخِ نخلِ طور تاڑی آشیانے کے لیے

۵۔ قصہ خواں نے کیوں سنا دی داستاں مجھکو مری
رہ گیا تھا میں ہی کیا اپنے فسانے کے لیے

۹۔ عشق نے مٹی کو مسجودِ ملائک کر دیا
ورنہ انسان اور فرشتے سر جھکانے کے لیے

۱۱۔ صبح پیدائش یہ کہتا تھا کسی کو دردِ عشق
آنکھ رُونے کے لیے ہے دل ٹوٹ جانے کے لیے

۱۲۔ ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبال نے
یہ غزل لکھی ہمایوں[1] کو سُنانے کے لئے

[1] میاں محمد شاہدین ہمایوں بیرسٹرایٹ لا۔

خفتگانِ خاک سے استفسار

۱۹۰۲ء

اقبال کی یہ نظم کلیاتِ اقبال اور بانگِ درا میں درج ہے لیکن ذیل کے اشعار موجود نہیں ہیں۔

۵۔ کام دھندا ہو چکا اب نیند ہے آرام ہے
ہائے وہ آغازِ محنت جس کا یہ انجام ہے

۱۳۔ وہ ولائت بھی ہمارے دیس کی صورت ہے کیا؟
شب وہاں کی کیا ہے؟ صبح و شام کی رنگت ہے کیا؟

۱۴۔ دل میں ہوتے ہیں اسی صورت سے پیدا ولولے
اس ولائت میں بھی کیا مجبور رہتے ہیں آے؟

۲۰۔ اس جدائی میں نہفتہ وصل کا سامان ہے کیا؟
چشم بستہ سرمۂ گوہر پئے انسان ہے کیا؟

صدائے درد

سنہ ۱۹۰۲ء

اقبال کی یہ نظم کلیات اقبال اردو بانگ درا میں درج ہے لیکن ذیل کے اشعار موجود نہیں ہیں۔

۲۔ اے ہمالہ تو چھپالے اپنے دامن میں مجھے
ہے غضب کی بیکلی اپنے نشیمن میں مجھے

۳۔ مدتیں گذری ہیں مجھ کو رنج و غم سہتے ہوئے
شرم سی آتی ہے اب اس کو وطن کہتے ہوئے

۴۔ آہ! ویرانی ہے پنہاں یاں کی ہر تعمیر میں
آشیاں اور اس گلستانِ خزاں تاثیر میں!

۵۔ آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح!
اپنے ہم جنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح

KARACHI

خطِ منظوم

سنہ ۱۹۰۲ء

اس نظم کا کچھ حصہ "عقل و دل" کے نام سے "بانگ درا" میں درج ہے

(پیغامِ بیعت کے جواب میں)

خِضر سے چھپ کے مر رہا ہوں مَیں
تشنہ کام مے فنا ہوں میں!

ہمکلامی ہے غیریت کی دلیل
خامُشی پر مٹا ہوا ہوں مَیں

کانپ اُٹھتا ہُوں ذکرِ مرہم پر
وُہ دِلِ درد آشنا ہوں میں!

تنکے چُن چُن کے باغِ اُلفت کے
آشیانہ بنا رہا ہوں مَیں

گُلِ پژمردۂ چمن ہوں مگر
رونقِ خانۂ صبا ہوں میں!

کارواں سے نکل گیا آگے
مثلِ آوازۂ درا ہوں مَیں

دستِ واعظ سے آج بنکے نماز
کس ادا سے قضا ہوا ہوں مَیں!

مجھ سے بیزار ہے دلِ زاہد
دیدۂ حور کی حیا ہوں میں؟

ہے زباں مائلِ ترانۂ شوق
سُننے والے کو دیکھتا ہوں مَیں

میں نے مانا کہ بے عمل ہوں مگر
رمزِ وحدت سے آشنا ہوں میں

پردۂ میم میں رہے کوئی
اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں

سب کسی کا کرم ہے یہ ورنہ
کیا مرا شوق اور کیا ہوں میں

میں کسی کو بُرا کہوں! توبہ!
ساری دنیا سے خود بُرا ہوں میں

جام ٹوٹا ہوا ہوں میں لیکن
مَے حق سے بھرا ہوا ہوں میں

ایک دانے پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

تو جُدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں

بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اُس عبادت کو کیا سراہوں میں

بُت پرستی تو ایک مذہب ہے
کفر غفلت کو جانتا ہوں میں

مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تو
تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں

عقل نے ایک دن یہ دل سے کہا
بھولے بھٹکوں کی راہ نما ہوں میں

ہوں زمیں پر گذر فلک پہ مری — دیکھ تو کس قدر رسا ہوں میں

علم پلتا ہے میری گودی میں — رازِ ہستی سے آشنا ہوں میں

رہبری دہر میں ہے کام مرا — رستۂ خضرِ خجستہ پا ہوں میں

ہوں مفسر کتابِ ہستی کی — مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں

تو مری ہمسری کرے! توبہ! — دیدۂ ہست کی ضیا ہوں میں

بوند اک خون کی ہے تو لیکن — غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں

دل نے سُن کر کہا کہ سب سچ ہے — پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

میرے دم سے جہاں بستا ہے — اس اندھیرے میں چاندنا ہوں میں

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن کو دیکھتا ہوں میں

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو خدا نما ہوں میں

علم کی انتہا ہے بے چینی — اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

[illegible] — حسن کی بزم کا دیا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش رب جلیل کا ہوں میں

گلشن طور میں بہار مری — قطرۂ بحر آشنا ہوں میں

تو ہے وابستۂ زمان و مکاں — اور اس قید سے رہا ہوں میں

ہائے یہ دل ہو میرے پہلو میں — تو یہ سمجھے کہ دہریا ہوں میں

اہل دل کو بگاڑ سے مطلب؟ — سب بزرگوں کی خاک پا ہوں میں

فیض اقبال ہے اُسی در کا

بندۂ شاہِ لافتا ہوں میں

آفتاب

سنہ ۱۹۰۲ء

صرف نظم "بانگ درا" میں موجود ہے لیکن اقبال کے تمہیدی نوٹس کے ساتھ اس نظم کو پڑھنے سے لطف اور دوبالا ہو جاتا ہے۔

ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گائتری کہتے ہیں یہ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا اُن تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظام عالم کے حیرتناک مظاہر کے مشاہدہ سے اول اول انسان ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا اس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علم ملل و النحل کے عالموں کے لئے انتہا درجہ کا ضروری ہے۔ کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کی ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے یہی وہ دُعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں جو لوگ محققین السنہ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں

اُن کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونس مرحوم کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اصل سنسکرت میں لفظ سوِتُر استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے اردو لفظ نہ ملسکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے لیکن اصل میں اس لفظ سے مراد اُس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیا نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے قرآن شریف میں آیا ہے "اللّٰہ نور السمٰوات والارض" اور شیخ محی الدین ابن عربیؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا علیٰ ہذا القیاس نور الٰہی کے مصری پیرووں اور ایران کے قدیم انبیا کا بھی یہی مذہب تھا

ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں یہ دقت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل الفاظ کی آواز موسیقیت اور وہ طمانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اُردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا گائتری کے مصنف نے ملک الشعرائے ٹنی سن مرحوم کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں حروف علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اسی مجبوری کی وجہ سے میں نے اپنے ترجمہ کی بنیاد اس سوکت (گفتار زیبا) پر رکھی ہے۔ جس کو سر یا نرائن اپنیشد میں گائتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے ترجمہ کرنے کو تو میں نے کر دیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قائم کریں گے جو جیپ سن نے پوپ کا ترجمہ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں۔ لیکن یہ گائتری نہیں ہے

محمد اقبال

اے آفتاب روح و روانِ جہاں ہے تو — شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو!
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا! — ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا!
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے! — ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے!
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے! — تیری نگاہ رشتۂ تارِ حیات ہے!
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے! — دل ہے خرد ہے روحِ رواں ہے شعور ہے!
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے — چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو! — یزداںؔ[1] ساکنانِ نشیب و فراز تو!
تیرا کمال ہستیٔ ہر جاندار میں! — تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں!
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو! — زائیدگانِ[2] نور کا ہے تاجدار تو!

نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری!

آزاد قیدِ اوّل و آخر ضیا تری!

[1] یزداں کو قدیم حکمائے ایران اصل نور تصور کرتے ہیں۔ اس واسطے خالق کی جگہ یہ لفظ استعمال کیا گیا

[2] یعنی دیوتے۔ سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں یعنی ایسی ہستی جن کی پیدائش نور سے ہو

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

غزل

۱۹۰۲ء

دل کی بستی عجیب بستی ہے — لوٹنے والے کو ترستی ہے

ہو قناعت جو زندگی کا اُصول — تنگدستی فراخ دستی ہے

جنس دل ہے جہاں میں کمیاب — پھر بھی یہ شے غضب کی سستی ہے

تاب اظہار عشق نے لے لی — گفتگو کو زبان ترستی ہے

ذکر جام طہور وعظ کی وعظ — مے پرستی کی مے پرستی ہے

شعر بھی اک شراب ہے اے دل — ہوشیاری اسی کی مستی ہے

ہم فنا ہو کے بھی فنا نہ ہوئے — نیستی اک طرح کی ہستی ہے

ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے۔ ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً اُن کا مفہوم وہی ہوگا جس کو ہم لفظِ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گرداننا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اقبال

آنکھ کو کیا نظر نہیں آتا! ابر کی طرح سے برستی ہے

دیکھیے کیا سلوک ہو اقبال

مجرم جرم بت پرستی ہے

متفرق اشعار

۱۹۰۲ء

(پوری غزل کے گیارہ شعر ہیں)

۵- یار جانی کہیں نہیں ملتا یوں تو ہوتے ہیں یار ہونے کو

۶- لالہ اور داغ دل بہانہ ہو دل جلوں میں شمار ہونے کو

(پوری غزل کے نو شعر ہیں)

۹- بغض اصحاب ثلاثہ سے نہیں اقبال کو

دق مگر اک خارجی سے آ کے مولائی ہوا

دربار بہاولپور

۱۹۰۳ء

ماہِ رواں میں چند روز سرزمینِ بہاولپور نے ایسے دیکھے ہیں۔ جن پر وہ تادیر ناز کرے گی۔ رعایائے بہاولپور کی مخلصانہ دُعائیں کامیاب ہوئیں۔ نخلِ تمنا ہرا ہوا۔ اور شاخِ آرزو پھل لائی۔ یعنی حضور پُرنور رکن الدولہ۔ نصرت جنگ۔ مخلص الدولہ۔ حافظ الملک ہز ہائی نس نواب محمد بہاول خاں پنجم۔ عباسی کو ہز ایکسلنسی وائسرائے و گورنر جنرل بہادر کشورِ ہند نے خود اپنے ہاتھوں سے مسندِ سلطنت پر بٹھایا۔ اور زمامِ اختیارات اُن کے ہاتھ میں دی۔ اس خوشی کی تقریب میں جو جشن ریاست میں منایا گیا وہ مُدتوں یادگار رہے گا۔ زمین بہاولپور ۱۲ ماہِ نومبر کی شام کو کثرتِ چراغاں سے رشکِ آسمان بن رہی تھی۔ اور سارا شہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک سجی ہوئی دلہن۔ ہجوم خلائق ایسا کہ معلوم ہو آبادی گرد و نواح میں کہیں باقی ہی نہیں رہی۔ سب کھنچکر بہاولپور میں آگئی ہے۔

روسائے عالی تبار اور راجگانِ ذی شان کے علاوہ دیگر معزز مہمان جو ہر فرقے

اور ہر طبقے کے منتخب لوگوں میں تھے اور ملک کے ہر گوشے سے آئے ہوئے تھے۔ زینتِ تقریب کو دوبالا کر رہے تھے۔ حکامِ انگریز کی بھی ایک معقول تعداد رونق بخشِ جلسہ تھی اس مبارک تقریب پر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے سے ایک قصیدہ کہنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ اور انہیں مدعو بھی کیا گیا تھا۔ مگر فرضِ منصبی سے رخصت نہ ملنے کی وجہ سے وہ جانے سے معذور رہے اور قلتِ فرصت سے قصیدہ بھی بعد میں مکمل ہوا۔ اس لئے ہم اسے ان تاجیر اوراق کے ذریعے سے بندگانِ عالی تک پہنچاتے ہیں۔ صاحبانِ فن دیکھیں گے کہ قصیدہ کی زمین کس قدر مشکل تھی۔ مگر اس میں کیسے کیسے شعرِ طبعِ خداداد کے زور سے شاعر نے نکالے ہیں۔ اور پرانے اور نئے رنگ کو کس خوبی سے ملایا ہے۔ چونکہ اب کے حصۂ نظم پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اور ہر نثر میں چند صفحوں کی گنجایش ہے اور اس قصیدہ کا اسی مہینے میں شائع ہونا موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے نثر کے حصے میں اس قصیدہ کو جگہ دیتے ہیں:۔

(سر) عبدالقادر

بزمِ انجم میں ہے گو چھوٹا سا اک اختر زمیں
آج رفعت میں ثریا سے بھی ہے اوپر زمیں

اوج میں بالا فلک سے مہر سے تنویر میں
کیا نصیبہ ہے رہی ہر معرکے میں ور زمیں

انتہائے نور سے ہر ذرہ اختر خیز ہے
مہر و ماہ و مشتری صیغے میں یا ہر صدر زمیں

لیکے پیغامِ طرب جاتی ہے سوئے آسماں
اب نہ ٹھہرے گی کبھی اطلس کے شانوں پر زمیں

شوقِ یک جائی کا ہے فیروزہ گردوں کو بھی
مول لیتی ہے لٹانے کے لیے گوہر زمیں

بسکہ گلشن رنگ ہے ہر قطرۂ ابرِ بہار
ہے شگفتہ صورتِ طبعِ سخن گستر زمیں

برگِ گل کی رگ میں ہے جنبش بہ رگِ جاں کی طرح
ہے ایسا اعجازِ عیسیٰ کی کہ افسوں گر زمیں

خاک پر کھینچیں جو نقشِ مرغِ بسم اللہ کا
قوتِ پرواز دیدے حرفِ قُم کہکر زمیں

صاف آتا ہے نظر حسنِ چمن میں عکسِ گل
بنگئی آپ اپنے آئینے کی روشنگر زمیں

اس قدر نظارہ پرور ہے کہ نرگس کے عوض
خاک سے کرتی ہے پیدا چشمِ اسکندر زمیں

امتحاں ہو اس کی وسعت کا جو مقصودِ چمن
خواب میں سا بڑھ کے آئے آسماں بنکر زمیں

چاندنی کے پھول پر ہے ماہِ کامل کا سماں
دن کو ہے اوڑھے ہوئے مہتاب کی چادر زمیں

آسماں کہتا ہے ظلمت کا جو ہو داغ اس میں
دھوئے پانی چشمۂ خورشید سے لیکر زمیں

چومتی ہے دیکھنا جوشِ عقیدت کا کمال
پائے تختِ یادگارِ بزمِ پیغمبر زمیں

زینتِ مسند ہوا عباسیوں کا آفتاب
ہو گئی آزاد احسانِ شہِ خاور زمیں

یعنی نواب بہاول خاں، کرے جس پر فدا
بحر موتی۔ آسماں انجم۔ زر و گوہر زمیں

جس کے بدخواہوں کی شمعِ آرزو کے واسطے
رکھتی ہے آغوش میں صد موجۂ صرصر زمیں

جس کی بزمِ مسند آرائی کے نظارے کو آج
دِل کے آئینے سے لائی دیدۂ جوہر زمیں

فیضِ نقشِ پا سے جس کے ہے وہ جاں بخشی کا ذوق
شمع سے لیتی ہے پروانے کی خاکستر زمیں

جسکی راہِ آستاں کو حق نے وہ رتبہ دیا
کہکشاں اسکو سمجھتا ہے فلک، محور زمیں

آستانہ جس کا ہے اُس قوم کی اُمیدگاہ
تھی کبھی جس قوم کے آگے جبیں گستر زمیں

جس کے فیضِ پا سے ہے شفاف مثلِ آئینہ
چشمِ اعدا میں چھپا کر خاک کا عنصر زمیں

جس کے ثانی کو نہ دیکھے تو نہ ڈھونڈے اگر
ہاتھ میں لیکر چراغِ لالۂ احمر زمیں

وہ سراپا نور اک مطلعِ خطابیہ پڑھوں
جس کے ہر مصرع کو سمجھے مطلعِ خاور زمیں

اے کہ فیضِ نقشِ پا سے تیرے گُل پرور زمیں
اے کہ تیرے دم قدم سے خسروِ خاور زمیں

اے کہ تیرے آستاں سے آسماں انجم بجیب
اے کہ ہی تیرے کرم سے معدنِ گوہر زمیں

لیکے آئی ہے برائے خطبۂ نام سعید
چوبِ نخلِ طور سے ترشا ہوا منبر زمیں

تیری رفعت سے جو یہ حیرت میں ہے ڈوبا ہوا
جانتی ہے ہر کرا اک مہرۂ ششدر زمیں

ہے سراپا طورِ عکسِ رائے روشن سے تری
ورنہ تھی بے نور مثلِ دیدۂ عبہر زمیں

مایۂ نازش ہی تو اس خاندان کے واسطے
اب تلک رکھتی ہی جسکی داستاں ازبر زمیں

ہو ترا عہدِ مبارک صبحِ حکمت کی نمود
وہ چمک پائے کہ ہو محسودِ مہر اختر زمیں

سامنے آنکھوں کے پھر جائے سماں بغداد کا
ہند میں پیدا ہو پھر عباسیوں کی ہمسر زمیں

محو کر دے عدل تیرا آسماں کی کجروی
کلیاتِ دہر کے حق میں بنے مسطر زمیں

صلح ہو ایسی گلے مل جائیں ناقوس و اذاں
ساتھ مسجد کے رکھے بتخانۂ آذر زمیں

نامِ شاہنشاہِ اکبر زندۂ جاوید ہے
ورنہ دامن میں لئے بیٹھی ہی تو قیصر زمیں

بادشاہوں کی عبادت ہے رعیت پروری
ہے اسی اخلاص کے سجدے سے قائم ہر زمیں

ہے مروت کی صدف میں گوہرِ تسخیرِ دل
یہ گہر وہ ہی کرے جس پر فدا کشور زمیں

حکمراں مستِ شرابِ عیش و عشرت ہو اگر
آسماں کی طرح ہوتی ہے ستم پرور زمیں

عدل ہو مانی اگر اس کا یہی فردوس ہے
ورنہ ہے مٹی کا ڈھیلا خاک کا پیکر زمیں

ہے گل و گلزار محنت کے عرق سے سلطنت
ہو نہ یہ پانی تو پھر سرسبز ہو کیونکر زمیں

چاہیے پیرا و باغ عاقبت اندیش کا
بے وری میں ہے مثال گنبد اخضر زمیں

لامکاں تک کیوں نہ جائیگی دعا اقبال کی
عرش تک پہنچی ہے جس کے شعر کی اڑ کر زمیں

خانداں تیرا رہے زیبندۂ تاج و سریر
جب تلک مثل قمر کھاتی رہے چکر زمیں

مسند احباب رفعت سے ثریا بوس ہو
خاک رخت خواب ہو اعدا کا اور بستر زمیں

تیرے دشمن کو اگر شوق گل و گلزار ہو
باغ میں سبزے کی جا پیدا کرے نشتر زمیں

ہو اگر پنہاں تیری ہیبت سے ڈر کر زیر خاک
بانگ کر لائے شعاع مہر سے خنجر زمیں

پاک ہے گرد غرض سے آئینہ اشعار کا
جو فلک رفعت میں ہو لایا ہوں وہ چن کر زمیں

تھی تو بہتر ہی مگر مدحت سرا کے واسطے
ہو گئی ہے گل کی پتی سے بھی نازک تر زمیں

اہلِ درد

۱۹۰۳ء

چند روز ہوئے اقبال اور گرامی اور بسمل یہ تین حضرات ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے۔ صاحب خانہ نے جو نوازش نام اور تخلص رکھتے ہیں۔ ایک مصرعہ بردیف "اہل درد" پڑھ دیا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اقبال نے بیان کیا تھا کہ انہیں درد قولنج کی شکایت ہے اور اُس وقت اُس کے آغاز کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ اس پر غزل گوئی کی فرمائش ہوئی اور اقبال نے بحالت درد مندرجۂ ذیل دو غزلیں اس زمین میں کہیں۔ مولوی عبید اللہ صاحب بسمل ایک فارسی قطعہ[1] تمہیداً اُن کے ساتھ لکھ انہیں بغرض اشاعت بھیجتے ہیں:۔

IQBAL ACADEMY KARACHI PAKISTAN

۱۔ اس قطعہ کا اندراج اس جگہ ہم غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

۱۳- یہ وہ پستی ہے کہ اس پستی میں ہے رفعت نہاں
سر کے بل گرتا ہے گویا زد یان اہل درد

۱۴- لیتے ہیں داغِ محبت سے گُلِ جنت مراد
ہائے کیا مرغوب ہے طرزِ بیانِ اہلِ درد

دیگر

صبرِ ایوب و فا خو جُز دِ جسانِ اہلِ درد
گریۂ آدم سرشتِ دودمانِ اہلِ درد
بے سکوں نا آشنا۔ طرح جہانِ اہلِ درد
جوں قمر سائر ہے قطبِ آسمانِ اہلِ درد
اوج یک مُشتِ غبارِ آستانِ اہلِ درد
جو ہر رفعت بلا گردانِ شانِ اہلِ درد
پھر رہے ہیں گلشنِ ہستی کے نظاروں میں مست

نکہتِ گل ہے شرابِ ارغوانِ اہلِ درد

ابتدا میں شرحِ رمزِ آہ لاتقنطوا!

کس قدر مشکل تھا پہلا امتحانِ اہلِ درد

ہمنشیں رونا ہمارا کچھ نیا رونا نہیں

تھی ہم آہنگ ندائے کن فغانِ اہلِ درد

شورشِ محشر جسے واعظ نے سمجھا ہوا

ہے وہ گلبانگِ درائے کاروانِ اہلِ درد

بتکدے کی سمت کیوں جاتا ہے یارب برہمن

کعبۂ دل ہی تو ہے ہندوستانِ اہلِ درد

گرمیِ جوشِ عقیدت سے کیا کرتی ہے طوف

کعبۂ برقِ بلا ہے آشیانِ اہلِ درد

ذبح ہونا کوچۂ الفت میں ہے اُن کی نماز

ہے صدا تکبیر کی گویا اذانِ اہلِ درد

دار پر چڑھنا نہ تھا معراج تھا منصور کو
تھی وہ سُولی درحقیقت نردبانِ اہلِ درد

موجِ خونِ سرمد و تبریزی و منصور سے
کس قدر رنگیں ہے یارب داستانِ اہلِ درد

تو نے اے انسانِ غافل آہ کچھ پروانہ کی
بیزباں طائر سمجھتے تھے زبانِ اہلِ درد

دیدۂ سوزن سے بھی رکھتے ہیں یہ پنہاں اسے
کوئی کیا دیکھے گا زخمِ بے نشانِ اہلِ درد

دیکھنے والے سمجھتے تھے دمِ عیسیٰ جسے
تھی وہ اک موجِ نسیمِ بوستانِ اہلِ درد

پھرتے رہتے ہیں میانِ کوچۂ جبل الورید
ہے اسی آوارگی میں عزوشانِ اہلِ درد

کہدیا اقبال اک مصرعہ نوازش نے تجھ آج
وہ بہانہ ہوگیا بہرِ بیانِ اہلِ درد

غزل

سنہ ۱۹۰۳ء

(پوری غزل کے ۸ شعر ہیں)

چند روز ہوئے سیالکوٹ میں ایک تقریب خوشی تھی۔ وہاں کے رئیس اعظم آغا محمد باقر خاں صاحب قزلباش کے فرزند ارجمند آغا محمد ناصر کے ختنہ کے بعد غسلِ صحت کی شادی منائی گئی تھی وہاں شیخ محمد اقبال صاحب بھی مدعو تھے۔ کسی نے ایک مصرع طرح دیا جس پر یہ غزل ہوئی۔ اور اس غزل کو انہوں نے اپنے دوست کے بیٹے کی اس تقریب سعید کا سہرا قرار دیا۔ چنانچہ اس کی طرف مقطع[1] میں اشارہ ہے۔

۲۔ ترا اے سیلِ دریائے محبت منتہا کوں کب تک
میری کشتی جو تھی آپ اپنے ہاتھوں سے ڈبوئی ہے

---

[1]:-

۳۔ کوئی شوخی تو دیکھے جب ذرا رونا تھا مرا
کہا بے درد نے "کیوں۔ آپ نے مالا پروئی ہے!"

۴۔ جھٹا جو کہدیا میں نے مگر تم نے بُرا مانا
خفا کیوں ہو گئے یہ عاشقوں کی بولی ٹھولی ہے

۵۔ شبِ فرقت تصور تھا مرا اعجاز تھا کیا تھا!
تیری تصویر کو میں نے بلایا ہے تو بولی ہے!

۷۔ تماشائی کوئی آئینہ ہستی میں ہے اپنا
مزا ہے حُسن نے اے دل کتاب عشق کھولی ہے

۱۰۔ ہمیں یاد وطن کیا پیش آنا ہے خدا جانے
بھلا تو کس لئے غربت زدوں کے ساتھ ہولی ہے

۱۴۔ یہ ہوگی شوخ اے صیاد مدت کی اسیری سے
نیا قیدی ہوں میں۔ آواز میری بھولی بھولی ہے

۱۵۔ لہو کی بوندیاں لائے کی کلیاں بنکے پھوٹی ہیں

گر زیر زمیں کھیلی ترے کشتوں نے ہولی ہے

موت کی ظلمت میں ہے پنہاں شراب زندگی
مر گیا ہوں یوں تو میں لیکن فنا کیوں کر ہوا
یوں تو مرتے ہو ہنسی ٹھٹھے پہ اے اقبال تم
دل تمہارا اس قدر درد آشنا کیوں کر ہوا

۱۹۰۲ء

بسکہ ہے باد صبا یاں کی اخوت آفریں
یہ وہ گلشن ہے جہاں سبزہ بھی بیگانہ نہیں

(سید کی لوح تربت پر)

۱۹۰۳ء

غزل

سنہ ۱۹۰۳ء

(پوری غزل کے ۹ اشعر ہیں)

۱۔ کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے
سرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

۴۔ نہ سیکھی تو نے مرغِ رنگِ گل سے رمزِ آزادی
یہ قید بوستانِ بلبلِ خیالِ آشیاں تک ہے

۵۔ وہ مے کش ہوں فروغِ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراقِ ساقیٔ نامہرباں تک ہے

۶۔ چمن افروز ہے صیاد میری خوش نوائی تک
رہی بجلی کی بے تابی سو میرے آشیاں تک ہے

۷۔ بنائیں چارہ گر نے دیدۂ حیراں کی زنجیریں!

نظر آسا مری وحشت میں بے تابی یہاں تک ہے

۸۔ میں خارِ خشک پہلو شعلۂ گلخن کے قابل ہوں

پڑے رہنا مرا گلشن میں، رحم باغباں تک ہے

۹۔ وہ مشتِ خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں

نہ پوچھو میری وسعت کی زمیں سے آسماں تک ہے

۱۰۔ مثالِ عکس بے تارِ نفس ہے زندگی میری

تری آسیب کاری اے اجل اقلیمِ جاں تک ہے

۱۱۔ زباں تک عقدۂ تب خالہ بن کر رہ گیا مطلب

اثر مجھ دل جلے کی بستہ کاری کا کہاں تک ہے!

۱۲۔ جرس ہوں میں صدا خوابیدہ ہے میرے رگ و پے میں

یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے!

۱۳۔ سکونِ دل سے سامانِ کشودِ کار پیدا کر

کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے؟

۱۴۔ نہیں منت پذیرِ چشم رونا شمعِ سوزاں کا
سمجھ غافل اگدازِ دل میں آزادی کہاں تک ہے

۱۶۔ بھلا اے گل کبھی اس رمز کو تو نے بھی سمجھا ہے ؟
تری شبنم فریبی کیوں بہارِ بوستاں تک ہے

۱۸۔ زمانے بھر رسوا ہوں مگر اے وائے نادانی !
سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

یہ ہے اقبال فیضِ یادِ نامِ مرتضیٰ جس سے
نگاہِ فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے

۲۰۔ عارضی حسن ہے دشمن ہے مرا نورِ سحر
یہ ملا خسرو خاور کا پیامی بن کر

۲۱۔ صبر کا خون نکل آیا ہو ل کر مجھ میں
ایک طوفاں ہوا افکار کا مضمر مجھ میں

(صبح کا ستارہ، ستمبر ۱۹۰۲ء)

(ترجمہ از ڈاک)

دل شمع صفت عشق سے ہو نور سراپا اور فکر یہ روشن ہو کہ آئینہ ہو گویا
نیکی ہو ہر اک فعل میں نیت کی ہو پیدا ہر حال میں ہو خالق ہستی پہ بھروسا

ایسی کوئی نعمت تہ افلاک نہیں ہے
یہ بات جو حاصل ہو تو کچھ باک نہیں ہے

۱۹۰۴ء

(پوری غزل ۲۸ شعر کی ہے)

۸۔ کہا کسی نے فسانہ جو عرش و کرسی کا
وہ سادہ لوح ہوں میں کر لیا یقین میں نے

۱۹۰۴ء

ماتم پسر

۱۹۰۲ء

ہمارے ایک عنایت فرما رئیس بارہ مولا علاقہ کشمیر خواجہ محمد جو صاحب لگڑ ہیں۔ انہیں چند ماہ ہوئے اپنے چھوتے اور ہونہار بیٹے کی مرگ ناگہاں کا داغ دیکھنا نصیب ہوا۔ خواجہ صاحب ذی علم۔ علم دوست رئیس ہیں اور خود زبان فارسی میں طبع شاعر ہیں اور مقبل تخلص کرتے ہیں۔ اس رنج نے ان کی طبیعت اور زندہ دلی پر پانی پھیر دیا ہے اور انہیں تصویر غم بنا دیا ہے۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے اُن کی طرف سے مرحوم کا نوحہ لکھا ہے جو درج ذیل ہے:۔

(مخزن)

اندھیرا قصر کا مکاں ہو گیا — وہ خورشیدِ روشن نہاں ہو گیا

بیاباں ہماری سرا بن گئی — مسافر وطن کو رواں ہو گیا

گیا اُڑ کے وہ بُلبلِ خوش نوا — چمن پائمالِ خزاں ہو گیا

نہیں باغِ کشمیر میں وہ بہار — نظر سے جو وہ گل نہاں ہو گیا

گیا کارواں اور میں راہ میں — غبارِ رہِ کارواں ہو گیا

گرا کٹ کے آنکھوں سے لختِ جگر — مرے صبر کا امتحاں ہو گیا

بڑھا اور اک دشمنِ جانستاں — دھواں آہ کا آسماں ہو گیا

ستم اِس غضب کا خزاں نے کیا — بیاباں مرا بوستاں ہو گیا

ہوئی غم کی عادت کچھ ایسی مجھے — کہ غم مجھ کو آرامِ جاں ہو گیا

کسی نوجواں کی جُدائی میں قد — جوانی میں مثلِ کماں ہو گیا

جُدائی میں نالاں ہو بلبل نہ کیوں — وہ گل زیبِ باغِ جناں ہو گیا

وہ سُرخی ہے۔ اشکِ شفق رنگ میں — حریفِ مئے ارغواں ہو گیا

بنایا تھا ڈر ڈر کے جو آشیاں — وہی نذرِ برقِ طپاں ہو گیا

کروں ضبط اے ہم نشیں کس طرح — کہ ہر اشک طوفاں نشاں ہو گیا
غضب ہے غلامِ حسن کا فراق — کہ جینا بھی مجھ کو گراں ہو گیا

دیا جن کے وہ غم ہے فلک نے اُسے
کہ مقبل سراپا فغاں ہو گیا

۱۸۔ عارضی لذت کا شیدائی ہوں چلّاتا ہوں میں
جلد آجاتا ہے غصہ جلد من جاتا ہوں میں

(طفل شیر خوار)

خلافت
اور
ترک و عرب

حضرت گرامی کی غزل بالا ہمارے پاس پوری نہیں بھیجی گئی ہے، اس غزل میں ایک شعر تھا، "فقر از ترکمانی ہم ہست" جو حضرت اقبال کو بہت پسند آیا تھا، اور اس پر تضمین کی تھی، حضرت اقبال اپنے ایک گرامی نامہ میں ہمیں کہتے ہیں کہ "پیام مشرق" میں اس واسطے اس کو داخل نہ کیا کہ اس کے اشعار کی بندش کچھ بہت پسند نہ آئی اگر آپ کو پسند ہو تو مجھے اشاعت میں کوئی عذر نہیں" یہ سچ ہے کہ پیام مشرق کے سازمیں یہ لحن شیرازی کچھ زیادہ

سامعہ نواز نہ ہو تو بھی اس سے الگ اقبال کی صدا کا

ہر حرف گوشوارۂ حقیقت ہے[۱]

سخنے راندۂ کہ جز قرشی | بر سرِ مسندِ نبی ﷺ نشست
درس گیر از "گرامی" ہمہ درد | کہ بر ید از خود و باو پیوست
رمزِ ترک و خلافتِ عربی | گفت آں میگسار بزمِ الست
"ماہ را بر فلک دو نیم کند | فقر را ترکمانی ہم ہست"

۱؎ معارف جلد ۱۳ نمبر ۲ صہ ۱۴۳

رُباعیات

کہکشاں میں آ کے اختر مل گئے اک لڑی میں آ کے گوہر مل گئے
واہ وا کیا محفل احباب ہے ہم وطن غربت میں آ کر مل گئے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستان میں آ ئے کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

پنجۂ ظلم و جہالت نے بُرا حال کیا بن کے مقراض ہمیں بے پر و بال کیا
تو اُس دستِ جفا کیش کو یارب جس نے رُوحِ آزادیِ کشمیر کو پامال کیا